بسم الله الرحمن الرحيم

اسلامی عقائد

از

حجۃ الاسلام
سید ظفر مہدی

زہراء (س) آکادمی

ACC No. 13031 Date 15/4/11
Section اصول دین
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی عقائد

از

ACC No. 13031 Date 15/4/11
Section اصول دین
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

حجۃ الاسلام

سید ظفر مہدی

زہراء (س) اکادمی

کتاب کا نام : اسلامی عقائد

مولف : حجۃ الاسلام سید ظفر مہدی

ناشر : زہراء (س) اکادمی

اشاعت : اول ۱۹۹۸ء / ۱۴۱۹ھ

تعداد : ۱۲۰۰

جملہ حقوق محفوظ

اسلامی عقائد

درس ۱

دین

لغوی معنی : اطاعت و جزا .....

اصطلاحی معنی : اس کائنات کے لئے کسی خالق کے ہونے پر اعتقاد اور اس عقیدہ سے ہم آہنگ عملی قوانین اور اصول۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ یہ اعتقاد نہیں رکھتے " بے دین " ہیں اور جو معتقد ہیں " دین دار " کہلاتے ہیں، چاہے ان کا دین انحراف کا ہی شکار کیوں نہ ہوچکا ہو۔ دینِ حق یعنی وہ دستور جو صحیح اور حقیقت پر مبنی ہو اور ایسے اعمال اور کردار کے حصول کی نصیحت کرتا ہو جو صحیح اور معتبر ہونے کی ضمانت رکھتے ہیں۔

دین حق کے علاوہ جتنے بھی دین ہیں وہ صرف اور صرف ان تحریفات کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں جو تدریجی طور پر دین میں کی گئی ہیں۔ جیسے دین اور سیاست میں جدائی وغیرہ .....

اصول دین اور فروع دین :

اس گفتگو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دین دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ وہ عقیدہ یا عقائد جو اس دین کی بنیاد اور جڑ کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی ان کے بغیر دین کا وجود ممکن نہیں ہے۔

۲۔ وہ عملی قوانین جو اس اعتقادی بنیاد کے ساتھ ہم آہنگی اور مناسبت رکھتے ہیں۔ پہلے حصے کو " اصول دین " اور دوسرے حصہ کو " فروع دین " کہا جاتا ہے۔

اسلام میں اصول دین کو عقلی دلیلوں کے ذریعہ سمجھنا ضروری ہے اور اس میں تقلید جائز نہیں ہے، جبکہ فروع دین سے متعلق مسائل کے لئے ضروری نہیں کہ ہر شخص خود دلیل کے ذریعہ علم حاصل کرے جسے اصطلاح میں "اجتہاد" کہا جاتا ہے، بلکہ ان مسائل میں کسی ایسے عالم اور صاحب نظر کی بات اور فتوی کے مطابق عمل کرنا کافی ہے جو مجتہد اعلم ہو، اسی کو اصطلاح میں " تقلید " کہتے ہیں۔

دین کی پیدائش:

محققین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ دین کیسے وجود میں آیا؟ جو بات ہم تک اسلامی ذرائع سے پہنچی ہے۔ وہ یہ ہے کہ دین کی پیدائش انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوگئی تھی، اور روئے زمین پر پہلے انسان اور نبی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

آسمانی ادیان کے درمیان مشترک اصول:

خدا، نبوت اور معاد یعنی قیامت، یہ تین اصلیں دنیا کے تمام آسمانی ادیان

میں مشترک ہیں اور ان اصلوں کی مختلف تفصیلات ہیں جو مل کر دین کے اعتقادی نظام کو تشکیل دیتی ہیں، جن میں اختلاف کے سبب مختلف ادیان وجود میں آئے، جیسے انبیاء علیہم السلام کی نبوت میں اختلاف کی وجہ سے یہودیت، عیسائیت، اور اسلامی فرقوں کے درمیان پیدا ہو جانے والا اختلاف واضح ہے۔

درس ۲

دین کے بارے میں تحقیق ضروری ہے

فرض کریں ہمارا واسطہ ایک لا دین شخص سے پڑتا ہے اور ہم اسے دین کی طرف دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آؤ دیکھیں کون سا دین ، حق ہے اور کون سا باطل ؟ وہ جواب دیتا ہے کہ کیوں ؟ مجھے تحقیق کی کیا ضرورت ہے ؟ اس کا کیا فائدہ ؟ تو ہم اسے جواب دیں گے کہ اگر ہم دین کے بارے میں تحقیق نہ کریں تو ایک بہت بڑے نقصان کا اندیشہ ، عذاب کی صورت میں ہمارے سروں پر مسلط ہے جو ہمیں بتا رہا ہے کہ اگر ہم دین حق کو حاصل نہ کریں اور اس پر عمل نہ کریں تو جہنم میں چلے جائیں گے اور اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ ایک بڑا نقصان ہے جسے کبھی بھی پورا نہیں کیا جا سکتا اور ہم ہمیشہ کے لئے اس عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے ۔

آئیے اس کی وضاحت کریں کہ جب ایک شخص کو پتہ چلتا ہے کہ تاریخ میں ایسے افراد گزرے ہیں جو انسان کو سعادت اور دائمی فائدہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور اسی دعوت کو عام کرنے کی خاطر ان افراد نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں اور یہ کہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد نے اس دعوت کو قبول کیا اور اس

کی راہ میں اپنی جانوں کو فدا کر دیا، تو یہ شخص سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کون سی ایسی چیز ہے جس کی خاطر اتنے انسان اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے ؟ آخر کار یہ شخص عقل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے کہ دیکھے انھوں نے کیا کہا ہے اور کن نقصانات اور فوائد کو بیان کیا ہے کہ ان کی دعوت کو ترک کر دینے کی صورت میں اتنا بڑا نقصان اور قبول کر لینے کی صورت میں ابدی فائدہ ! ! یہ شخص اگر فائدہ کو خاطر میں نہ بھی لائے تو کم از کم اس نقصان سے بچنے کی خاطر تحقیق پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ...

آئیے اب اپنے بارے میں گفتگو کریں کہ اب جبکہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور اپنے دین پر عمل کرنے میں مصروف ہیں تو کیا اب بھی کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت باقی ہے ؟ یقیناً ایسا ہی ہے ؟ کیا ہی اچھا ہو کہ ہر کچھ عرصہ بعد اپنی اس تحقیق پر ایک تنقیدی نظر ڈال لیا کریں تاکہ ہمیں اس بات کا اطمینان حاصل ہوتا رہے کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں اور جو تحقیق ہم نے کی تھی وہ صحیح تھی اور اگر کہیں پر غلطی بھی کی ہو تو اس کی اصلاح ہو جائے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ پہلی تحقیق کے ذریعہ ہم نے غلط نتیجہ نکالا ہو اور اسی کو صحیح سمجھ کر عمل کر رہے ہوں اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان اپنی تحقیق کو کبھی بھی کافی نہ سمجھے بلکہ مسلسل اس پر تجدید نظر کرتا رہے۔

درس ۳

جیسا کہ دین کے اصطلاحی معنی میں بتایا گیا کہ " دین " اس کائنات کے لیے ایک خالق کے ہونے پر اعتقاد کا نام ہے ، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس عقیدہ تک پہنچنے کا راستہ بتائیں تاکہ بعد میں دوسرے جزئی مسائل میں داخل ہو سکیں ، کیونکہ جب تک یہ عقیدہ ثابت نہیں ہو جاتا کسی اور عقیدہ یا قانون کا ثابت کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم چاہیں کہ بیج بوئے بغیر ہی ایک درخت اگا کر اس کے پھل کھانا شروع کر دیں لہذا پہلے ضروری ہے کہ اس بنیادی عقیدہ پر تحقیق کر لی جائے ، اگر ہماری تحقیق اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے تب ہم اس کے صفات اور بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام اور اس کے بنائے ہوئے قوانین وغیرہ پر بحث کر سکتے ہیں ۔

خالق کی معرفت کا طریقہ :

خالق کائنات کی شناخت کے سلسلے میں بہت سے طریقے بیان کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ انسان اس عظیم ذات کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے، ان میں کچھ راستے آسان ہیں اور کچھ مشکل ، ہم چونکہ پہلے مرحلہ پر ہیں لہذا سب سے زیادہ آسان راستے کو بیان کر رہے ہیں ۔ اور وہ کائنات کے اندر موجود نظم و ضبط کے بارے میں غور کرنا ہے ۔ انسان اپنے اطراف میں موجود اشیاء پر غور کرے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر چیز میں ایک خاص نظام پایا جاتا ہے جو اس

بات کی علامت ہے کہ اسے کسی عاقل و دانا ذات نے ایک خاص مقصد کے تحت بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب کو لے لیں ، آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کتاب کو لکھنے والا ایک عاقل اور پڑھا لکھا شخص ہے اور اس نے بلا وجہ ہی اس کتاب کو نہیں لکھ ڈالا بلکہ اس کتاب کو لکھنے کا ایک مقصد اس کے ذہن میں تھا جس کے حصول کے لئے اس نے اس کتاب کو لکھا۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ کتاب اصل میں بعض اتفاقات کی وجہ سے وجود میں آ گئی کچھ کاغذ کہیں سے بن کر آ گئے ، پھر اس پر تھوڑی سے روشنائی گر گئی اور وہ کچھ اس طرح سے گری کہ حروف اور پھر ان سے الفاظ بن گئے اور اتفاق سے وہ الفاظ معنی کے اعتبار سے آپس میں مناسبت بھی پیدا کر گئے اور پھر وہ سارے کاغذات خود بخود مرتب ہوکر جلد کی شکل میں آ گئے اور ان سارے اتفاقات کا نتیجہ یہ ہے کہ فلاں کتاب ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہم اس سے اپنے علم میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کتنی احمقانہ سوچ ہے ! کوئی بھی عاقل اس طرح نہیں سوچ سکتا اور اگر کوئی اس طرح سے سوچے تو ہمیں اس کی عقل پر شک ہوگا۔

چیونٹی کی ہی مثال پر غور کریں اور دیکھیں کہ بظاہر وہ ایک حقیر سی مخلوق ہے لیکن اس کی زندگی میں کتنا زبردست نظام پایا جاتا ہے ، قدرت نے اسے احساس و شعور کی وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں کہ انسان دنگ رہ جائے اس کی قوت شامہ (سونگھنے کی صلاحیت) بہت تیز ہوتی ہے ، جہاں کہیں بھی خوراک موجود ہو یہ اپنی اس حس کی مدد سے وہاں پہنچ جاتی ہے ، اپنے جسم سے بیس گنا زیادہ وزن اٹھا لیتی ہے ، گرمیوں میں اپنے لئے خوراک کا ذخیرہ فراہم کرتی ہے تاکہ سردیوں میں اسے مشکل پیش نہ آئے ، اپنے گھر کا راستہ کبھی نہیں بھولتی وغیرہ وغیرہ.....

اس طرح سے اگر ہم بقیہ مخلوقات کے بارے میں بھی غور کریں تو ہمیں

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ نظام نظر آئیں گے ۔ یہ نظام کہاں سے آئے ؟ یقیناً ان کو وجود میں لانے والی کوئی ہستی موجود ہے ، کیونکہ یہ خود بخود تو وجود میں نہیں آ گئے ۔

اب ہم خالق کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے ایک دوسری دلیل بیان کر رہے ہیں جو پہلی دلیل کے مقابلے میں ذرا زیادہ توجہ چاہتی ہے ؟ آئندہ دروس میں ہمیں اس سے استفادہ کرنا ہے ۔

علت و معلول کی دلیل :

ہر وہ موجود جو اپنے وجود کے لئے کسی اور موجود کا محتاج ہو اسے " معلول " کہتے ہیں ، وہ دوسرا موجود جس کا یہ محتاج ہوتا ہے " علت " کہلاتا ہے ۔ اب اگر یہ " علت " اپنے وجود کے لئے کسی اور موجود کی محتاج ہو تو یہ اس کی نسبت "معلول " کہلائے گی اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا ، موجودات کے اس سلسلے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسی ہستی پر جاکر ختم ہو جو صرف علت ہی ہو اور کسی اور موجود کی محتاج نہ ہو ، یعنی معلول نہ ہو ۔ اگر ایسی ہستی نہ ہو تو کوئی بھی معلول وجود میں نہیں آ سکتا ۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک کھانے کی میز پر دس آدمی موجود ہیں اور کھانا شروع کرنے کے لئے ہر شخص اس بات کا منتظر ہے کہ کوئی اور شروع کرے تو پھر وہ شروع کرے ، اگر یہ سب قیامت تک اسی طرح بیٹھے رہیں تب بھی کوئی کھانا شروع نہیں کر سکتا ، اسی طرح اگر سب موجودات اپنے وجود کے لئے ایک دوسرے کے محتاج رہیں تو سرے سے ان سب کا وجود میں آنا ممکن ہی نہ ہوگا اور چونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اتنے بہت سے موجودات وجود میں آ چکے ہیں لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی

ہستی موجود ہے جو کسی کی محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں اور اسے " اللہ " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

واجب الوجود اور ممکن الوجود:

مندرجہ بالا بیان کے بعد اب آپ کو دو نئی اصطلاحوں سے آشنا کر رہے ہیں۔ اس ہستی کو جس کے سب محتاج ہیں لیکن وہ کسی کی محتاج نہیں اور جسے ہم " علت " کے نام سے یاد کرتے ہیں " واجب الوجود " کہا جاتا ہے اس کے علاوہ جتنے بھی موجودات ہیں وہ سب " ممکن الوجود " کہلاتے ہیں۔

واجب الوجود یعنی اس کا وجود ضروری ہے اور وہ اپنے وجود کے لئے کسی دوسرے موجود کا محتاج نہیں ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی وقت موجود نہ ہو لیکن ممکن الوجود کے لئے وجود ضروری نہیں ہے بلکہ وہ معدوم بھی ہو سکتا ہے، یہ اپنے وجود کے لئے کسی دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔

درس ۴

پچھلے درس میں ہم نے ثابت کیا کہ اس کائنات کا بنانے والا موجود ہےاور اسے ہم نے " واجب الوجود " کے نام سے یاد کیا۔ لیکن صرف واجب الوجود کے عنوان سےاس کی شناخت کافی نہیں کیونکہ ممکن ہےکوئی کہے کہ " مادہ " یا "انرجی " ہی واجب الوجود کا مصداق ہیں، لہذا اب ہم چاہتے ہیں کہ بعض صفات کواس سے سلب کریں اور بعض کوثابت کریں تاکہ ان صفات کے مشخص ہو جانے کے بعد ہم بہتر طور پر اس عظیم ذات کو پہچان سکیں اور انحراف کا شکار نہ ہوں۔

دو اہم صفات:

پچھلے درس میں ہم نے واجب الوجود کے اثبات کے ضمن میں اس کے دو اہم صفات کی طرف اشارہ کیا۔

۱۔ اس کا ازلی ہونا۔

۲۔ اس کا ابدی ہونا۔

واجب الوجود کی ازلیت اور ابدیت:

کسی بھی موجود کاایک زمانہ میں معدوم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ

اپنے وجود کے لئے کسی علت کا محتاج ہے اور چونکہ واجب الوجود کی کوئی علت نہیں لہذا وہ ہمیشہ سے ہے یعنی ازلی ہے اور اسی طرح وہ اپنے وجود کے دوام کے لئے بھی کسی اور چیز کا محتاج نہیں ہے یعنی ابدی ہے، حقیقت میں زمانہ کا تصور اس کے بارے میں ناممکن ہے ان دو صفات کو "سرمدی" کے عنوان سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

واجب الوجود ایک لامحدود ہستی ہے،

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک مقدمہ کا بیان ضروری ہے اور وہ یہ کہ موجودات میں پایا جانے والا فرق، ان کے کامل اور ناقص ہونے پر مبتنی ہے۔ مثلاً دو انسان "موجود" ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ایک عالم ہے اور دوسرا جاہل۔ یعنی پہلے انسان کا وجود دوسرے کے مقابلے میں کامل تر ہے جبکہ دوسرا انسان اس کے مقابلے میں ناقص ہے کیونکہ وہ انسانی کمالات میں سے ایک کا حامل نہیں ہے یعنی علم نہیں رکھتا لہذا اس کی ذات ناقص ہے اور وہ اپنے اس نقص کو دور کرنے کے لئے کسی ایسے عالم کا محتاج ہے جو اسے علم عطا کرے۔

اسی طرح واجب الوجود اور ممکن الوجود میں بھی فرق "کمال" اور "نقص" کا ہے کہ واجب الوجود ہر لحاظ سے ایک کامل وجود ہے جبکہ ممکن الوجود ناقص ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ وجود کے کمالات میں سے بعض کا حامل نہیں ہوتا جیسے غنی اور بے نیاز ہونا، ممکن الوجود محتاج ہے لیکن واجب الوجود محتاج نہیں ہے اور تمام وجودی کمالات کا حامل ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اگر وہ وجود کے کسی کمال کا حامل نہ ہو تو اس کی ذات میں نقص لازم آ جائے گا اور وہ اپنے اس

نقص کو دور کرنے کے لئے کسی اور موجود کا محتاج ہو جائے گا جبکہ ہم گزشتہ گفتگو میں اس کی بے نیازی کو ثابت کر چکے ہیں ، لہذا ہم نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اس عظیم ذات میں کسی قسم کا نقص نہیں پایا جاتا اور وہ ایک کامل وجود ہے اور اس کے لئے کسی قسم کی حدود قائم نہیں کی جا سکتیں ۔ کیونکہ وجود کا ہر وہ کمال جسے تصور کیا جا سکتا ہو اس میں پایا جاتا ہے اور محدود ہونا ناقص ہونے کی علامت ہے ۔

پس واجب الوجود ایک لا محدود ہستی ہے ۔

توجہ :

ابھی ہم جس مطلب کی طرف توجہ دلا رہے ہیں اس کے بیان کی ضرورت اگرچہ مندرجہ بالا گفتگو کے بعد نہیں رہتی لیکن اس کا بیان کر دینا غیر مناسب بھی نہیں ہے ۔

وہ یہ کہ واجب الوجود کے لئے ضروری ہے کہ اپنے معلولات میں پائے جانے والے کمالات کو ان سب سے زیادہ رکھتا ہو ، کیونکہ اگر وہ ان میں سے بعض کمالات کا حامل نہیں ہوگا تو کس طرح دوسرے موجودات کو فیضیاب کر سکتا ہے؟ جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر موجود کو اس کی ظرفیت کے مطابق کمال کے درجات ملے ہوئے ہیں ۔ یاد رہے کہ معلولات و مخلوقات کے کمالات کے حامل ہونے کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے بقیہ صفات جیسے جسم وغیرہ بھی اس عظیم ذات میں موجود ہوں ، کیونکہ یہ صفات اس کی ذات کے لئے نقص کا باعث بنتے ہیں اور یہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اس میں کسی بھی قسم کا نقص نہیں پایا جاتا ۔ لہذا ہر وہ صفت جو کمال کا درجہ رکھتی ہو اور نقصان کا باعث نہ بنے ، اس کی ذات پر منطبق ہے ۔

درس ۵

توحید

اس درس میں ہم توحید کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں، اس لئے پہلے مرحلہ پر "توحید" کے معنی کا روشن ہو جانا ضروری ہے۔ "توحید" یعنی خدا وند متعال کو ہر لحاظ سے یکتا و تنہا ماننا۔ جب ہم مختلف زاویوں سے اس ذات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر زاویہ سے اس میں توحید کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے یعنی وہ ہر لحاظ سے ایک ہی ہے اور اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے آئیے ذرا ان زاویوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ طور پر وضاحت کر دیں۔

توحید ذاتی:

پچھلے درس میں ہم نے واجب الوجود کے لا محدود ہونے کو ثابت کرنے کے ضمن میں بیان کیا کہ موجودات میں پایا جانے والا فرق ان کے کامل اور ناقص ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھیں کیونکہ حالیہ گفتگو میں ہم اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب آئیے دیکھیں کہ واجب الوجود اگر ایک سے زیادہ مثلاً دو ہوں تو کیا حرج پیش آئے گا۔

کسی بھی چیز کے دو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں آپس میں کوئی فرق پایا جاتا ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر ان میں کوئی فرق نہ ہو تو وہ دو کیوں ہوئے؟

اس صورت میں ہم اس دو ہونے کو کوئی معنی نہیں دے سکتے۔ فرق کے معنی بھی ہم پچھلی گفتگو میں بتا چکے ہیں۔ یعنی یا پہلے واجب الوجود میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں ہے تو اس صورت میں دوسرے واجب الوجود میں نقص لازم آئے گا اور وہ واجب الوجود نہیں رہے گا یا پھر دوسرے میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو پہلے میں نہیں تو پہلے میں نقص لازم آئے گا اور وہ واجب الوجود نہیں رہے گا۔ کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کسی موجود کے لئے ناقص ہونے کا مطلب اس کا محتاج ہونا ہے، جبکہ واجب الوجود ہر لحاظ سے بے نیاز اور غنی ہے۔ یہاں ہم نے واجب الوجود کی ذات کے ایک ہونے کو ثابت کیا ہے اس لئے اس عقیدہ کو اصطلاح میں "توحید ذاتی" کہا جاتا ہے۔

توحید صفاتی:

صفات میں توحید کا مطلب یہ ہے کہ واجب الوجود کے صفات اس کے وجود سے ہٹ کر کوئی علیحدہ وجود نہیں رکھتے، بلکہ وہ اسی کی ذات ہیں اور وہ دراصل ہم ہیں جو اس لامحدود ذات کو مختلف زاویوں سے اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں تاکہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے بہتر طور پر اسے پہچان سکیں۔ اب آئیے اس بات کو ثابت کریں۔

اگر یہ صفات اسکی ذات کے علاوہ ایک مستقل وجود رکھتے ہوں تو پچھلی تقسیم کی بنیاد پر یا ممکن الوجود ہیں یا واجب الوجود ہیں۔ اگر واجب الوجود ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک سے زیادہ واجب الوجود پائے جاتے ہیں اور ہم اس کو

غلط ثابت کر چکے ہیں۔ اگر ممکن الوجود ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ اپنے وجود کے لئے واجب الوجود کے محتاج ہیں۔ لہذا ان صفات کو خود واجب الوجود نے ہی خلق کیا ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا واجب الوجود پہلے سے ان صفات کا حامل تھا؟ اگر پہلے سے یہ صفات اور کمالات اس میں موجود تھے تو انھیں خلق کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اور اگر وہ ان صفات کا حامل نہیں تھا تو پھر کہاں سے اس نے ان کو وجود بخشا؟ بالآخر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ واجب الوجود کے صفات اس کی ذات سے ہٹ کر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے بلکہ خود اس کی ذات ہی ہیں۔ اس عقیدہ کو اصطلاح میں "توحید صفاتی" کہتے ہیں۔

درس ۲

ہدف خلقت

لغت میں اس نقطہ کو جسے تیر انداز اپنا نشانہ بناتا ہے "ہدف" کہتے ہیں۔ اور اصطلاح میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے حصول کے لئے کوئی شخص اپنے اختیار سے کسی کام کو انجام دے۔ ان کاموں کے اہداف و مقاصد جو اختیاری طور پر انجام دیئے جاتے ہیں، دو حالتوں پر مشتمل ہیں۔ یا تو انھیں کسی فائدے اور کمال کے حصول کی خاطر انجام دیا جاتا ہے یا پھر کسی نقصان سے بچنے کے لئے ان کاموں کو انجام دیا جاتا ہے۔

ممکن ہے کوئی کام بظاہر ہمیں ایسا نظر آئے کہ نہ تو انجام دینے والے کے لئے کسی فائدے کا باعث بن رہا ہو اور نہ ہی اس کو کسی نقصان سے بچا رہا ہو لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس میں بھی ہمیں انھیں دو حالتوں میں سے ایک حالت ملے گی، مثال کے طور پر ایک ماں اپنے بچے کی پرورش اور تربیت کی خاطر بے شمار زحمتیں اٹھاتی ہے اس کو کیا فائدہ مل رہا ہے؟ یا وہ اپنے آپ کو کس نقصان سے بچا رہی ہے؟ پہلی نظر میں خود ماں کو کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا لیکن حقیقت میں وہ اپنی ممتا کی تسکین کی خاطر اتنی مصیبتیں جھیل رہی ہوتی ہے اگر وہ ان زحمتوں کو برداشت نہ کرے تو اس کی فطری چاہت پر برا اثر پڑے گا اس کا ضمیر اس کی ملامت کرتا رہے گا اور اس اذیت میں مبتلا ہو جانا ایک

نقصان ہے اور وہ اپنے آپ کو اس نقصان سے بچانے کی خاطر زحمتیں اٹھاتی ہے۔

اب آئیے دیکھتے ہیں کہ خداوندعالم نے جس مقصد اور ہدف کے تحت اس کائنات کو خلق کیا ہے، کیا وہ بھی انھیں دو حالتوں میں سے ایک پر مشتمل ہے؟

یقیناً ایسا نہیں ہے، کیونکہ وہ کمال مطلق ہے ایسا کوئی کمال نہیں جو اس میں نہ ہو اسے کسی فائدہ کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح اس کو کسی نقصان کا اندیشہ بھی نہیں ہے کیونکہ وہ تمام نقائص سے پاک ہے۔ آخر کار وہ کون سا مقصد ہے جسکے حصول کے لئے اس نے اس عظیم کائنات کو وجود بخشا؟

اس سوال کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی وضاحت ضروری ہے۔

ایک عاقل جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو مندرجہ ذیل تین مقاصد میں سے کسی ایک کو مدنظر رکھتا ہے:

۱۔ صرف اپنے فائدے کے لئے انجام دیتا ہے۔

۲۔ اپنے اور دوسروں کے فائدے کے لئے انجام دیتا ہے۔

۳۔ صرف دوسروں کے فائدہ کے لئے انجام دیتا ہے۔

خداوند متعال کی ذات کے بارے میں پہلی دو صورتوں کا تصور محال ہے، کیونکہ ہم اس کی بے نیازی کو ثابت کر چکے ہیں۔ لہذا صرف آخری صورت ہی رہ جاتی ہے جو صرف دوسروں کے کے فائدے کے بارے میں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا فائدہ ہے جو وہ دوسروں کو پہنچانا چاہتا ہے؟ اس فائدے کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل بیان کو توجہ کے ساتھ پڑھیں۔

اس دنیا میں موجودات دو قسم کے ہیں۔

۱۔ مجرد موجودات

۲۔ مادی موجودات

مجرد موجودات وہ ہیں جنھیں ان کے کمالات کو ایک دفعہ میں عطا کر دیا گیا

ہے جیسے فرشتے کہ جنھیں ان کا مقام و منزلت ان کی پیدائش کے ساتھ ہی مل گیا اور اب ان کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ کسی اور کمال کی طرف قدم بڑھا سکیں۔

" و ما منا الا له مقام معلوم "

اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک درجہ مقرر ہے۔ (سورہ صافات ، آیت ۱۶۴)

لہذا ان کی خلقت کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے ایک مخصوص مقام پر رہیں اور اپنی اپنی ظرفیت کے مطابق رحمت الہیٰ سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

مادی موجودات وہ ہیں جنھیں اپنے کمال کو تدریجی طور پر حاصل کرنا ہے یعنی ان کو اس لئے خلق کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کمالات کو آہستہ آہستہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے حاصل کریں۔ خداوند متعال نے زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی اشیاء کی خلقت کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

" هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ثم استویٰ الی السمآء فسوٰیهم سبع سماوات وهو بکل شیء علیم "

وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے تمہارے (فائدے کے) لئے زمین کی کل چیزوں کو پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو سات آسمان ہموار (و مستحکم) بنا دیئے، اور وہ (خدا) ہر چیز سے واقف ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۹)

یعنی ان کو اس لئے خلق کیا گیا ہے کہ انسان ان سے استفادہ کرے۔

و سخر لکم ما فی الارض جمیعاً منه ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون۔

اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو (اپنے حکم سے) تمہارے کام میں لگا دیا ہے جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے اس میں (قدرت کی) بہت سی نشانیاں

ہیں ۔ (سورہ الجاثیہ ، آیت ۱۳)

یعنی ان سب چیزوں کو پیدا کیا گیا ہے تاکہ انسان ان کے بارے میں غور و فکر سے کام لے اور اپنے کمال تک پہنچنے کے راستوں کو انھیں میں تلاش کرے اسی طرح انسان کی خلقت کے ہدف کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ :

" الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً "

(اللہ) جس نے موت و زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے عمل میں سب سے اچھا کون ہے۔ (سورہ ملک ، آیت ۲)

یعنی انسان کو زندگی عطا کی اور موت کو بھی قرار دیا تاکہ اس زندگی کے دوران اس کے کاموں پر نظر رکھی جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں زیادہ اچھے کام کرنے والے افراد کون ہیں تاکہ انھیں انعام واکرام اور نعمتوں سے نوازا جائے ۔ ابھی تک ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کے علاوہ بقیہ مادی موجودات کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ انسان ان سے استفادہ کرے اور خود انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آزمائش کی جائے ۔

تھوڑا سا غور کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی تک یہ مسئلہ ہمارے لئے مکمل طور پر حل نہیں ہوا ہے اور یہ سوال ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے کہ انسان کی آزمائش کیوں کی جائے ؟ اس کا امتحان کیوں لیا جائے؟

امتحان لینے کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں بعض اوقات ایک استاد اپنی آگاہی کے لئے امتحان لیتا ہے تاکہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکے ، بعض اوقات امتحان لینے کا مقصد شاگردوں کی استعداد بڑھانا ہوتا ہے ۔

علم ، خداوند علام کی صفات کمالیہ میں سے ایک ہے لہذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انسان کی صلاحیتوں کو " جاننے " کے لئے انھیں آزماتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے ۔ حقیقت میں انسان کی آزمائش کا مقصد اس کی صلاحیتوں

کو پروان چڑھانا ہے تاکہ وہ اپنے کمال تک پہنچ سکے اور اپنے پروردگار کے باران رحمت سے اچھی طرح فیض یاب ہوسکے ۔ یہاں پھر یہ سوال پیش آتا ہے کہ خداوند متعال کیوں چاہتا ہے کہ انسان اس کی رحمتوں سے اس طرح استفادہ کرے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ تمام کمالات کا سرچشمہ ہے لہذا ان کمالات کو عطا کرنا اس کے وجود کا لازمہ ہے کیوں کہ اپنے پاس موجود کمال کو عطا کرنا صفات کمالیہ میں سے ہے اور خدا وند متعال میں تمام صفات کمالیہ پائے جاتے ہیں ۔

آزمائش کی بنیادی شرط اختیار ہے :

یہاں پر ایک نکتہ کی طرف توجہ بہت ضروری ہے کہ آزمائش صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب انسان کو اپنے کاموں میں مکمل اختیار حاصل ہو یعنی جب اسے صحیح اور غلط راستوں کو انتخاب کرنے کا اختیار ہوگا تبھی اس کا امتحان لیا جاسکتا ہے کیونکہ اگر اس کو یہ اختیار حاصل نہ ہو تو ایسا ہی ہے جیسے وہ چاہے تو اس کائنات کو اسی نظام کے مطابق چلنے دے اور اگر وہ ایسا نہ چاہے تو نہ چلنے دے ۔ اس موقع پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا امتحان لیا گیا اور اس نے صحیح یا غلط راستہ اختیار کرکے کامیابی یا ناکامی حاصل کرلی یعنی انسان کے کمال تک پہنچنے کا راز اس کے " مختار " ہونے میں پوشیدہ ہے ۔

درس ۷

عدل

" عدل " ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے یا اسے اس کا حق ادا کرنے یا دلوانے کا نام ہے اور جو شخص اسے انجام دیتا ہے اسے " عادل " کہتے ہیں۔

عدل خداوند عالم کے صفات میں سے ایک صفت ہے یعنی اس نے نہ تو اس کائنات کی خلقت میں کسی کمی یا زیادتی سے کام لیا ہے اور نہ ہی اس کائنات کے لئے بنائے گئے قوانین اور احکام میں کوئی کوتاہی کی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اس نے اس کائنات کو انسان کے لئے خلق کیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے کمال تک پہنچ سکے۔

عدل کو جب ہم خداوند متعال کی نسبت سے دیکھتے ہیں تو اسے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ خلقت اور تکوین میں عدالت سے کام لیا ہے۔

۲۔ قانون سازی اور تشریع میں بھی عدل کا لحاظ کیا ہے۔

خدا وند عالم نے اس کائنات کے ایک ایک ذرے کو اس کی اپنی خاص جگہ اور ایک خاص مقصد کے تحت خلق کیا ہے کہ اگر اس کائنات کا ایک جزء بھی اپنی جگہ سے ہٹتا ہے تو حرج پیش آ جاتا ہے، مثال کے طور پر انسان کے بدن کے کسی بھی عضو پر غور کریں جیسے ہاتھ کا انگوٹھا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان کی

زندگی میں کیا مشکلات پیش آئیں اور جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں ان کو کن مشکلات کا سامنا ہے۔ اسی طرح اس عظیم ذات نے انسان کے اعمال کو قابو میں رکھنے کے لئے قوانین بھی بنائے ہیں کہ ان قوانین پر عمل کرتے رہنے سے انسان کسی کا حق مارے بغیر ایک پر سکون زندگی گزار سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ عدالت خدا وند عالم کے صفات میں سے ایک ہے اسے دین کے اصول میں کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ کسی اور صفت کو اصول دین میں کیوں نہیں قرار دیا گیا؟

اس سوال کے جواب میں تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ بعض محققین کی نظر میں عدل کی بحث کی بنیاد سیاسی مسائل ہیں، یہ بحث عباسی خلفاء نے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے چھیڑی تھی، چونکہ وہ بہت سے ایسے گناہوں کے مرتکب ہونا چاہتے تھے جو خلافت کی شان کے خلاف تھے، لہذا انھوں نے اپنے دربار کے نام نہاد علماء کے ذریعے اس بحث کو چھیڑا کہ خدا وند عالم جو کچھ انجام دیتا ہے وہ عدل ہے اور ہم اپنی عقل کے ذریعے کسی کام کی اچھائی اور برائی کو نہیں سمجھ سکتے اور چونکہ خداوند عالم کا ہر کام عدالت پر مبنی ہوتا ہے لہذا خلیفۃ المسلمین بھی جو کچھ کرتا ہے وہ صحیح اور عدل کے مطابق ہوتا ہے۔

اس طریقے سے انھوں نے اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

۲۔ بعض دوسرے محققین کی اس سے ملتی جلتی رائے ہے کہ حکومت نے اس بحث کو اس لئے چھیڑا تھا کہ لوگ اسی میں مشغول رہیں اور ان کے سیاسی کردار سے غافل رہیں۔

۳۔ وہ لوگ جو عدل کو اصول دین میں سے نہیں مانتے ان کا عقیدہ ہے کہ ہماری عقلیں کسی بھی کام کی اچھائی یا برائی کو نہیں سمجھ سکتیں اور جو کچھ خداوند عالم انجام دیتا ہے وہ عین عدل ہے لہذا اگر وہ تمام انبیاء علیہم السلام کو جہنم میں

بھی ڈال دے تب بھی عادل ہی کہلائے گا۔

ہم اس عقیدے کے مخالف ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم نے ہمیں عقل جیسی نعمت سے نوازا ہے جس کے ذریعے ہم اچھائیوں اور برائیوں کو سمجھ سکتے ہیں، خداوند متعال ظلم نہیں کر سکتا بلکہ ہمیشہ عدل سے ہی کام لیتا ہے۔

ظلم کیوں کیا جاتا ہے؟

ہم یہاں پر ان عوامل و اسباب کی طرف اشارہ کرنا چاہ رہے ہیں جن کی وجہ سے آدمی ظلم کرتا ہے۔

۱۔ جہالت

بعض اوقات ظلم کی بنیاد جہالت ہوتی ہے مثلاً انسان نہیں جانتا کہ انسانوں میں قومیت، رنگ اور نسل کی بنیاد پر کسی کو فضیلت حاصل نہیں ہے، بلکہ فضیلت صرف اعمال اور کردار کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے اور جب وہ اس بات کو نہیں سمجھتا تو دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر گورے، سیاہ فاموں پر اس لئے ظلم کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھتے ہیں، یہودی اپنی برتری کے زعم میں مسلمانوں پر ظلم کرتے چلے آ رہے ہیں، بوسنیا میں صرب نسل پرست بھی اپنے آپ کو اعلیٰ نسل سمجھ کر مظلوم مسلمانوں پر ستم ڈھا رہے ہیں۔

۲۔ خوف

بعض اوقات خوف بھی ظلم کا سبب بنتا ہے جیسے بڑی طاقتوں کو ہمیشہ مسلمانوں سے خوف رہتا ہے کہ کہیں یہ ہمارے خلاف کھڑے نہ ہو جائیں اور ہمیں اپنے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے ، لہذا وہ مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ کسی چیز کی کمی یا ضرورت ،

بعض اوقات محرومیاں اور مادی ضروریات بھی ظلم کا سبب بنتی ہیں جیسے چوری ، ڈکیتی وغیرہ۔

۴۔ ذہنی امراض

بعض مظالم کا سبب صرف اندرونی خباثت ہوتی ہے۔ جیسے کچھ لوگ دوسروں کو اذیت پہنچا کر لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ اس طرح کے تمام لوگ در حقیقت ذہنی مریض ہوتے ہیں۔

جب ہم خداوند متعال کی ذات کو مد نظر رکھتے ہیں تو ہمیں مذکورہ عوامل میں سے کوئی بھی عامل اس کے بارے میں ممکن نظر نہیں آتا ، کیونکہ وہ کمال مطلق ہے ، نہ جاہل ہے نہ خائف ہے ، نہ ناقص ہے اور نہ ہی چوتھی قسم کو اس کے بارے میں تصور کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ظلم نہیں کرتا اور اس کا ہر کام عدل کے مطابق ہوتا ہے۔

انسان اور عدل:

خداوند عالم کی عدالت پر اعتقاد رکھنا انسان کی تربیت میں ایک بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے یعنی جو شخص یہ ایمان رکھتا ہے، وہ گناہوں کے مقابلے میں اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے اور ان سے دور رہنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اسے اپنے ہر عمل کی جزا ملے گی چاہے وہ اچھے اعمال ہوں چاہے برے۔ اسی طرح وہ دنیا اور اس کے مسائل کے بارے میں بھی خوش بین رہتا ہے، اسے ہر کام میں خداوند متعال کی کوئی مصلحت نظر آتی ہے، لہذا وہ کبھی بھی غمزدہ نہیں ہوتا خداوند عالم کی عدالت پر ایمان رکھنے سے انسان میں بھی عدالت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر قسم کے ظلم سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ کسی اور کو ظلم کرنے دیتا ہے۔

درس ۸

انبیاء کی ضرورت

جب ہمارے لئے ثابت ہو گیا کہ ہماری خلقت کا مقصد کمال تک پہنچنا ہے تو آیئے اب دیکھیں کہ کمال تک پہنچنے کا کیا راستہ ہے؟ اس تک رہنمائی کون کرے گا؟ تکامل یعنی کمال تک پہنچنے کے راستے مختلف موجودات کے لئے مختلف ہیں، لہذا ہر مخلوق اپنے کمال تک پہنچنے کے لئے ایک علیحدہ رہنما کی محتاج ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم تمام مخلوقات کو ایک کلی تقسیم کے ذریعے دو گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ وہ موجودات جو اپنے کمال تک پہنچنے کے لئے کسی اور موجود کے محتاج نہیں ہیں۔

۲۔ وہ موجودات جو اپنے کمال تک پہنچنے کے لئے کسی اور موجود کے محتاج ہیں۔

تمام مخلوقات کی ہدایت کے بارے میں قرآن کریم حضرت موسیٰ کی زبان سے یوں فرماتا ہے:

"قال ربنا الذی اعطیٰ کل شیء خلقه ثم هدیٰ"۔

(سورہ طہٰ، آیت ۵۰)

(موسیٰ نے) کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی (مناسب) صورت عطا فرمائی پھر اسی نے ہدایت کی۔

اسی طرح پہلے گروہ کے بارے میں ارشاد ہے :

" و اوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً " (نحل ۶۷)

اور (اے رسول) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تم پہاڑوں میں اپنے گھر بناؤ ۔

اس آیت میں ہدایت کو " وحی " کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے لیکن مراد یہ نہیں ہے کہ شہد کی مکھی کے لئے ایک پیغمبر بھیجا گیا تاکہ وہ اسے شہد کا چھتہ بنانا سکھائے یا اس پر جبرئیلؑ وحی لے کر نازل ہوئے بلکہ یہاں پر مراد وہ ہدایت ہے جسے ان کی فطرت اور سرشت میں شامل کر دیا گیا ہے ۔ یعنی یہ ہدایت خود ان کے وجود میں ہے ۔

انسان کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے کیونکہ اس کےاندر ایسا کوئی رہنما نہیں ہے جو اسے کسی اور کی رہنمائی سے بے نیاز کر دے ۔ البتہ آج انسان کو اپنی عقل اور علم پر بہت ناز ہے لہذا وہ دعوی کرتا ہے کہ انسانیت کی فلاح (یعنی کمال) کا راستہ اپنی عقل کے ذریعہ ڈھونڈ سکتا ہے اور اسے کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمارے نقطہ نظر سے یہ بات غلط ہے کیونکہ جو شخص بھی اپنا راستہ خود معین کرنا چاہتا ہے ، بالفاظ دیگر اگر انسان چاہتا ہے کہ اپنا ضابطۂ حیات خود معین کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل شرائط پر مشتمل شناخت کا حامل ہو :

۱۔ انسان کی شناخت

یعنی اسے خود اپنے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوں تاکہ اپنی ضروریات سے آگاہ ہو سکے ۔

۲۔ ہوا و ہوس کا نہ ہونا

یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ اس ضابطۂ حیات کو بنانے میں اپنے نفس کی خواہشات کا تابع ہوجائے اور وہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں۔

۳۔ خوف کا نہ ہونا

اس کو کسی چیز کا خوف بھی نہ ہو جو اس کو صحیح راستے سے ہٹ جانے پر مجبور کر دے۔

۴۔ خطا اور لغزش کا نہ ہونا

یعنی اس کی عقل اور علم غلطی کے مرتکب نہ ہوں۔

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد انسان یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ ان شرائط پر پورا نہیں اترتا اور اس مخصوص شناخت کا حامل نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی میں مسلسل دیکھ رہا ہے کہ بار بار اس کی عقل غلطی کرتی ہے کبھی اس کی ہوس اس پر غالب آجاتی ہے کبھی کسی کے ڈر سے اپنا راستہ بدل دیتی ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان ابھی تک اپنے بارے میں مکمل شناخت حاصل نہیں کرسکا ہے اور اتنی ساری چیزیں ایجاد کر لینے اور طرح طرح کے انکشافات کے باوجود بھی اسے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انسان اور انسانیت کے بے شمار پہلو ابھی تک تاریکی میں ہیں اور وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ لہذا اس ضابطۂ حیات کے معین کرنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں بچتا کہ

خود خالق کائنات اپنا کرم کرے اور انسان کی رہنمائی فرمائے۔

اس رہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک رابطہ برقرار ہو اس رابطے کو ہم معمولی دنیاوی اور مادی معیاروں پر قائم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عظیم ذات ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اس سلسلے میں ہم ایک حدیث بیان کر رہے ہیں اس پر خاص توجہ دیں:

ہشام بن حکم سے نقل ہوا ہے کہ ایک زندیق نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ تم انبیاء اور رسل ؑ کو کس طرح ثابت کرتے ہو؟ تو امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ہم نے جب ثابت کر دیا کہ ہمارا ایک خالق و صانع ہے جو تمام مخلوقات سے برتر ہے اور سب سے زیادہ حکمت رکھتا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی مخلوق اسے دیکھے یا لمس کرے اور بغیر کسی واسطے یا رابطے کے ایک دوسرے سے مخاطب ہوں اور بات کریں تو ثابت ہو گیا کہ اس کے کچھ سفیر اس کی مخلوق کے درمیان ہیں جو اس کے ارادے اور رضایت کو بیان کرتے ہیں کہ ان کے لئے کس کام میں مصلحت ہے؟ اور کون سی چیزیں تباہی و بربادی کی باعث ہوتی ہیں؟ پس امر کرنے والوں اور نہی کرنے والوں کا خدائے حکیم کی طرف سے مقرر نمائندوں کی صورت میں ہونا ثابت ہو گیا اور وہی پیغمبر ہیں جو خداوند کریم کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ یہ وہ حکماء ہیں کہ جن کی حکمت کے مطابق تربیت ہوئی ہے اور وہ اسی کے مطابق مبعوث ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ خلقت و اندام میں عام لوگوں کے ساتھ شریک ہیں لیکن حالات اور اخلاق میں ان جیسے نہیں ہیں۔ (اصول کافی، ج ۱، کتاب الحجۃ ح ۱)

کیا خداوند متعال پر لازم ہے کہ انسان کی رہنمائی کرے؟

اپنی گزشتہ گفتگو کے ذریعے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کی سامنے متعدد

راستے کھلے ہوئے ہیں اور ان میں سے صرف ایک ہی راستہ اسے اپنی منزل تک پہنچا سکتا ہے اور اس کے علاوہ اسے اختیار بھی حاصل ہے کہ جس راستہ کو چاہے انتخاب کرے یہاں پر یہ ضروری ہے کہ خالق کائنات اس کے لئے صحیح راستہ کی نشاندہی کرے۔ کیونکہ اگر وہ اس مقام پر انسان کی رہنمائی نہیں کرتا تو خلقت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اس لئے کہ انسان اس کے بغیر کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ اپنے کسی ایسے دوست کی دعوت کرتے ہیں جس نے ابھی تک آپ کا گھر نہیں دیکھا ہے، اگر آپ اسے اپنے گھر کا راستہ نہیں بتاتے تو وہ کیسے آپ کی دعوت میں شریک ہو؟ آپ کے پاس دو ہی راستے بچتے ہیں۔

۱۔ دعوت کا اہتمام نہ کریں کیونکہ وہ پہنچنے سے قاصر ہے۔

۲۔ اس کی رہنمائی کریں یعنی پتہ بتائیں یا کسی کو اسے لینے کے لئے بھیجیں۔

لہذا خداوندعالم کو چاہیئے کہ اپنے بندوں کی رہنمائی کا کوئی انتظام کرے اور بہترین انتظام کسی نمائندے کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ وہ زبانی بھی راستہ کو بیان کرے اور خود بھی اس پر چل کر دکھائے تاکہ تمام انسان اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔

درس ۹

امامت (۱)

امامت کی بحث مکتب تشیع میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ یہی وہ بنیادی عقیدہ ہے جس کی بنیاد پر شیعہ مذہب کو دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور دوسرے الفاظ میں ہم اس عقیدے کو مکتب تشیع اور دیگر مکاتب کا نقطۂ اختلاف بھی کہہ سکتے ہیں۔ خود مکتب تشیع میں اس عقیدے کی اہمیت کا بیان تشریح کا محتاج نہیں ہے بلکہ صرف اس عنوان کا جان لینا کافی ہے کہ یہی وہ امتیازی پہلو ہے جو اس مکتب کو دوسرے مکاتب کے مقابل میں حاصل ہے۔

اصل میں امامت سے اہم اور غور طلب بحث اس اصل کی بقیہ اصول و فروع میں مقام و حیثیت کی ہے اور یہ بحث خود فلسفۂ امامت و رہبری کی بحث کا ضروری مقدمہ ہے۔ اس بحث میں داخل ہونے سے پہلے دو مطالب کا بیان ضروری ہے:

۱۔ لفظ "امام" کی تشریح

۲۔ اس واقعیت کا بیان کہ انسان کے تمام عقائد و اعمال خود اس کی طرح دو پہلو رکھتے ہیں یعنی ظاہر و باطن یا جسم و روح۔

۱۔ مفردات راغب میں لفظ "امام" کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ "وہ چیز جس

کی پیروی کی جائے۔" اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ چیز انسان ہو کہ اس کی گفتار و کردار کے حوالے سے پیروی ہو یا کوئی کتاب ہو یا کوئی اور چیز۔ اور اسی طرح اس چیز کے حق و باطل ہونے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے یعنی ممکن ہے وہ چیز حق ہو یا باطل۔

پس ہمیں پتہ چل گیا کہ امام ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اور جب ہم اس کی انسان پر تطبیق کرتے ہیں تو امام یعنی وہ شخص جو رشد و تکامل یا تنزل و پستی کے مراحل طے کرنے اور کروانے کا نمونہ و رہبر ہو۔

رشد و تکامل کی طرف رہنمائی کرنے والے ائمہ کی ہمیں تاریخ میں بہت سے مثالیں ملتی ہیں، جیسے انبیاء اور ہمارے ائمہ علیہم السلام۔ اسی طرح پستی کی طرف لے جانے والے ائمہ کی مثالیں بھی بے تحاشہ ہیں جیسے فرعون، نمرود، ابو جہل وغیرہ۔ پس انسان جس حد تک بھی مندرجہ بالا دو راستوں میں سے کسی پر آگے بڑھتا چلا جائے امام کا مفہوم اس پر اتنا ہی صادق آتا چلا جائے گا یہاں تک کہ امامت مطلقہ تک پہنچ جائے جو اس راستے کا عروج و نہایت ہے۔

اس بات کی تائید ہمیں قرآن کریم میں بھی ملتی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو مخاطب قرار دے کر فرماتا ہے کہ چونکہ تم لوگوں کو ان کے کمال کی طرف ہدایت کرتے ہو اس لئے ہم نے تمھیں ان کا امام بنا دیا ہے۔

انی جاعلک للناس اماما (بقرہ / ۱۲۴)

اے ابراہیمؑ میں نے تمہیں امت کا امام قرار دیا ہے۔

و جعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا (سورہ انبیاء / آیت ۷۳)

اور ہم نے ان میں ایسے امام اور پیشوا قرار دیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح فرعون اور تاریخ کے ان پلید عناصر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :

وجعلنا هم ائمة يدعون الى النار (قصص ۴۱)

اور ہم نے انھیں ایسا امام بنا دیا جو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

فقاتلوا ائمة الكفر (توبہ / ۱۲)

اہل کفر کے اماموں کے ساتھ جنگ کرو۔

۲۔ اسلام کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت جو بہت حساس اور دقیق بھی ہے وہ یہ ہے کہ مکتبی نقطہ نظر سے انسان کے عقائد و اعمال دو پہلوؤں کے حامل ہیں۔

ظاہر و باطن یا جسم و روح جیسے نماز جس کا ظاہر، مقررہ الفاظ و اعمال ہیں اور اس کا باطن و روح در اصل " حضور قلب " ہے جسے قرآن کریم نے " ذکر " سے تعبیر کیا ہے۔

اقم الصلاة لذكرى (طٰہٰ / ۱۴)

میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔

اسی طرح بقیہ اعمال و عقائد جیسے حج و جہاد و توحید وغیرہ۔

توجہ :

۱۔ یہ امور جن کا تذکرہ ہوا یہ انسان کے تکامل کے سلسلے میں تھے اسی طرح پستی و رذالت کے درجات بھی ظاہر و باطن رکھتے ہیں۔

۲۔ ضروری نہیں کہ انسان کی عقل تمام اعمال و عقائد کے ظاہر و باطن کو درک کر سکے بلکہ ہر عقل اپنی حدود میں رہتے ہوئے ہی انھیں درک کرتی ہے۔

اب ہم اپنی بحث کی طرف آتے ہیں کہ امامت کا بقیہ اصول و فروع میں کیا

مقام ہے ؟ اسلامی متون کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امامت انسان کے تمام عقائد و اعمال کی روح یعنی باطن ہے ۔ لہذا اگر انسان تکامل کے راستے کو طے کرنا چاہتا ہے تو اسے اس روح کو اپنے اندر ، اپنے معاشرے کے اندر پیدا کرنا ہوگا اور اسی طرح اگر انسان چاہتا ہے کہ کسی بھی قسم کے عقائد واعمال کو ختم کرے تو پہلے اسے اس روح کو ختم کرنا ہوگا ۔

اس مطلب کو بہت وضاحت کے ساتھ امام موسی کاظم علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے ۔ محمد بن منصور کا کہنا ہے کہ میں نے امام علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی :

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها و ما بطن (اعراف / ۳۳)

کہہ دو کہ میرے پروردگار نے ظاہر و باطن دونوں طرح کی برائیوں کو حرام قرار دیا ہے ۔

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا :

ان للقرآن ظهر و بطن فجميع ما حرم اللّٰہ فی القرآن هو الظاهر ، والباطن من ذلک ائمة الجور ، و جميع ما احل اللّٰہ تعالی فی الكتاب هو الظاهر و الباطن من ذلک ائمة الحق ۔

قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے ، تمام وہ امور جنھیں خدا نے قرآن میں حرام قرار دیا ہے وہ ظاہر قرآن ہیں اور ان کا باطن ائمہ جور ہیں اور اسی طرح وہ تمام امور جنھیں خدا نے کتاب میں حلال قرار دیا ہے ظاہر کتاب ہیں اور ان کا باطن ائمہ حق ہیں ۔

اس حدیث سے ہمیں چند نکات سمجھ میں آتے ہیں :

۱۔ پہلے امام علیہ السلام تفسیر کے بارے میں ایک کلی قاعدہ بتاتے ہیں کہ قرآن کے معانی دو قسم کے ہیں ایک ظاہری دوسرے باطنی یعنی قرآن کی دو طریقوں

سے تفسیر کی جا سکتی ہے مذکورہ آیت کی ظاہری تفسیر یہ ہے کہ خداوند عالم نے تمام برے اعمال کو حرام قرار دیا ہے چاہے وہ چھپ چھپا کر انجام دیئے جائیں، چاہے کھلے عام۔

۲۔ امام علیہ السلام اس آیت کی باطنی تفسیر کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمام فسادات کی جڑ ائمہ جور ہیں اور جب تک یہ امامت باقی ہے برائیاں اپنی جگہ پر باقی رہیں گی اور اس امامت کو ختم کئے بغیر امت کی اصلاح کی جتنی کوششیں ہوں گی پائدار ثابت نہیں ہوں گی۔ پس فساد کو معاشرے سے ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کی جڑ یعنی امام ظلم و جور کو ختم کیا جائے۔

۳۔ ائمہ جور کا خاتمہ اصلاح و تکامل کی طرف پہلا قدم ہے جبکہ دوسرا قدم جو بلافاصلہ اٹھانا چاہیئے وہ ائمہ حق کو ان کی صحیح جگہ پر بٹھانا ہے۔ اسی لئے امام علیہ السلام نے فوراً ہی فرمایا کہ **و جمیع ما احل.....**

لہذا اسلام وانقلاب کی تاریخ میں سب سے اہم اور حساس مرحلہ امام حق کی صحیح تشخیص اور اس کی پیروی ہے۔

اب ہم ذیل میں اپنے مطلب کی تائید میں ایک حدیث بیان کر رہے ہیں۔

قال رسول اللّٰہ

من مات بغیر امام مات میتة جاهلية

جو شخص بغیر امام کے اس دنیا سے گیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہاں جاہلیت سے مراد، اسلام سے پہلے کا زمانہ ہے کیونکہ عرب اس زمانے میں جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ابھی اسلام کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جاہلیت کی موت یعنی وہ موت جو اسلام پر نہ آئے، پس اگر امامت کو اسلام سے نکال دیں تو ہمارے زمانے میں اور اسلام سے پہلے کے زمانے میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

درس ۱۰

امامت (۲)

شیعہ معتقد ہیں کہ امت مسلمہ کی قیادت کی ذمہ داری ہمارے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے داماد اور چچازاد بھائی حضرت علی علیہ السلام کے کاندھوں پر آئی اور ان کے بعد ان کے گیارہ فرزندوں نے یکے بعد دیگرے اس فرض کو نبھایا ہے ہمارے آخری امام (عج) پردہ غیبت میں ہیں وہ مناسب حالات فراہم ہو جانے پر ظہور فرما کر دنیا کو ظلم و ستم سے نجات دلا دیں گے اور معاشرے میں عدل الٰہی کو نافذ کر دیں گے۔

نبوت و امامت پر موجود تمام عقلی دلائل مشترک ہیں۔ ہم چونکہ نبوت پر عقلی دلیل پیش کر چکے ہیں لہذا یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اس میں ہم امام علی علیہ السلام کی امامت پر موجود چند روایت پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ حدیث ثقلین:

یہ بہت معروف حدیث ہے جسے شیعہ و سنی دونوں ہی نے تواتر سے نقل کیا ہے اس حدیث میں رسول خداؐ نے فرمایا کہ:

"میں تمہارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم ان سے

مرتبط رہے تو کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے ، کتاب خدا جو زمین و آسمان کے درمیان رسی کی مانند ہے اور میری عترت و اہل بیت ، یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آئیں ، پس غور سے دیکھو کہ میرے بعد تم ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔"

۲۔ حدیث یوم انذار

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو حق کی طرف دعوت دو اور انھیں عذاب کا خوف دلاؤ۔ پیغمبر اکرمؐ نے ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اپنے خاندان والوں کو بلایا ، ابولہب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس ضیافت کا مقصد کیا ہے ، کھانا ختم ہوتے ہی اس نے پوری مجلس کو درہم برہم کر دیا ، اگلے روز رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پھر دعوت دی اور ابولہب نے پھر وہی کیا لیکن تیسرے دن رسول خداؐ کامیاب ہوگئے اور انھوں نے کھانے کے بعد ان سے خطاب فرمایا کہ :

" میں عرب میں کسی ایسے جوان کو نہیں جانتا جو اپنے قبیلے کے لئے مجھ سے بڑھ کر کوئی چیز لایا ہو ، میں دنیا و آخرت کی خیر و برکت تمہارے لئے لایا ہوں ۔ تم میں سے کون حاضر ہے کہ اس کام میں میری مدد کرے تاکہ تمہارے درمیان میرا بھائی ، وصی و خلیفہ قرار پائے ؟"

حضرت علی علیہ السلام کے سوا کسی نے جواب نہیں دیا ۔ رسول خداؐ نے تین دفعہ اپنے سوال کی تکرار کی اور ہر دفعہ حضرت علی علیہ السلام نے ہی جواب دیا ۔ تو پیغمبر اکرمؐ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ " یہ میرا بھائی ، وصی و خلیفہ ہے ، تم لوگوں کے درمیان ، لہذا اس کی بات سنو اور اس کی

اطاعت کرو۔"

۳۔ حدیث منزلت:

جنگ تبوک کے موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو شہر میں عورتوں اور بچوں کے پاس چھوڑا تو حضرتؑ نے پوچھا کہ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ رہے ہیں؟ تو اس موقع پر رسول خداؐ نے فرمایا:

"کیا تم راضی نہیں ہو کہ تمھیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی اس فرق کے ساتھ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، مناسب نہیں ہے کہ میں چلا جاؤں مگر یہ کہ تم میرے خلیفہ بن کر رہو۔"

۴۔ حدیث غدیر:

بحدیث مذکورہ احادیث میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ حضرت علیؑ کی خلافت و ولایت پر دلالت کر رہی ہے۔ غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام امت کے سامنے پہلے لوگوں سے توحید و رسالت و قیامت کا اقرار کرایا اور فرمایا: بار الہا تو گواہ رہ۔"

اور پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اے لوگوں پس میں جس کا مولا ہوں یہ علیؑ بھی اس کے مولا ہیں، بارالہا دوست رکھ ہر اس شخص کو جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمنی کر ہر اس

شخص سے جو علیؑ کے ساتھ دشمنی کرے۔"

بقیہ ائمہؑ کی امامت کے بارے میں بھی متعدد روایات موجود ہیں لیکن ہم اختصار کی وجہ سے ان کے ذکر سے پرہیز کر رہے ہیں اور اگلے درس میں انشاء اللہ تعالی امام آخر الزمان (عج) کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

درس ۱۱

امام آخر الزمان

حضرت مہدی (عج)

امام زمانہ (عج) کے بارے میں بہت گفتگو اور تحقیق ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اس موضوع کے ضمن میں بہت سے ضمنی موضوعات ہیں جیسے طول عمر، علائم ظہور .... وغیرہ ہم یہاں پر ان میں سے ایک نہایت اہم موضوع پر گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ فلسفہ غیبت ہے۔ یعنی امام زمانہ (عج) کی غیبت کیوں عمل میں آئی؟

مندرجہ بالا سوال کے ہم دو جواب دے سکتے ہیں کیونکہ خود یہ سوال بھی اصل میں دو سوالات پر مشتمل ہے۔ ایک طرف ہم اس سوال سے یہ سمجھتے ہیں کہ غیبت کا فلسفہ پوچھا جا رہا ہے، دوسری نظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ غیبت کی علت پوچھی جا رہی ہے۔

کسی بھی کام کے فلسفہ اور علت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے فلسفہ اصل میں حکمت کو کہتے ہیں یعنی اس کام کے ذریعے کن فوائد کو حاصل کیا جا رہا ہے؟ جبکہ علت وہی سبب ہے کہ اس کام کا کیا سبب تھا؟ مثال کے طور پر نماز تمام انسانوں پر واجب ہوئی۔ اس کی حکمت و فلسفہ یہ ہے کہ انسان حضور

قلب پیدا کرے اور اپنے خدا کے قرب کو حاصل کرے۔ (اس مطلب کی طرف درس نمبر ۹ میں اشارہ ہو چکا ہے) لیکن اس واجب کی علت کچھ اور ہے کہ وہ شخص چونکہ بالغ و عاقل ہے اور نماز کا وقت بھی ہو چکا ہے اس لئے اس پر نماز واجب ہوگئی۔ ذیل میں ہم در اصل فلسفۂ غیبت پر روشنی ڈالنا چاہ رہے ہیں اور اس کے ضمن میں علت کے بارے میں بھی گفتگو کریں گے کیونکہ بہت سے لوگوں کے لئے فلسفہ و علت آپس میں مشتبہ ہو گئے ہیں اس مطلب کو جاننے کے لئے مندرجہ ذیل بیان کو توجہ کے ساتھ پڑھیں۔

اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس زمانے میں سیاسی حالات بہت خراب تھے، دس ائمہ علیہم السلام کو شہید کیا جا چکا تھا۔ امام حسن عسکری علیہ السلام پر بہت سختی تھی، متعدد جاسوس صرف اس کام پر لگے ہوئے تھے کہ جیسے ہی ان کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہو اسے جان سے مار دیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب جو امام آنے والا ہے یہ وہی مہدی موعود (ع) ہے جس کی کامیابی کی نوید انبیاء اور ائمہ علیہم السلام نے دے دی ہے اور وہ آ کر ان کی حکومتوں کا خاتمہ کر دے گا۔ اسی لئے جیسے جیسے آخری امام کا زمانہ نزدیک آ رہا تھا، حکام جور کی اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ دشمنی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی وحشت و خوف بڑھتا چلا جا رہا تھا بارہویں امام کے متعلق احادیث کو انھوں نے بھی سن رکھا تھا اور وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور میں ہر لحہ ان کی پیدائش کے منتظر تھے البتہ وہ ان کی زیارت کے لئے نہیں بلکہ انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے بیتاب تھے۔ ادھر شیعوں میں اتنا زور نہیں تھا کہ امام زمانہ (ع) کی حفاظت کر سکیں لہذا خود خداوند عالم نے انھیں ایک مدت کے لئے منظر عام سے ہٹا دیا تاکہ جب حالات اجازت دیں تو ان کو ظاہر کر دے اس کا قصور بھی مسلمانوں کے سر جاتا ہے

کیونکہ اگر وہ صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے تو کبھی بھی یہ حالات پیش نہ آتے۔

دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ مسلمانوں کو سزا دینے کے لئے یہ غیبت انجام پائی کیونکہ وہ مسلسل تنزلی کا شکار ہو رہے تھے اور اپنی ذمہ داریوں کو انجام نہیں دے رہے تھے لہذا انھیں اس نعمت سے فی الحال محروم کر دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ عملاً اپنے آپ کو اور اپنے معاشرے کو امام زمانہ (عج) کے قابل بنائیں۔

تیسری رائے کہتی ہی کہ غیبت کا رازیہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد دیکھا جائے کہ قوم کس حد تک اسلامی تعلیمات پر باقی رہتی ہے یعنی ان کی آزمائش کی جائے۔

مذکورہ آراء کو نظر میں رکھیں اور اس سوال پر غور کریں کہ جب ہم نے متعدد روایات میں اس غیبت کے متعلق پیش گوئی سن لی اور مختلف وعدے وعید وغیرہ بھی ان میں دیکھ لئے تو اب ہمارے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ "غیبت" کیا انسانی تکامل کے مختلف مراحل میں سے ایک ہے؟ یا نہیں بلکہ یہ ایک اضطراری اور ہنگامی حالت ہے جو اسلام و امام کو پیش آئی اور اس لئے یہ اقدام کرنا پڑا؟ جیسے امام حسین علیہ السلام کے لئے ایسے حالات پیش آ گئے تھے کہ پورے اسلام کے ختم ہو جانے کا خدشہ تھا لہذا انھوں نے قیام کیا۔

ہمارے خیال میں مذکورہ آرا کو بیان کرنے والے غیبت کی علت اور فلسفہ کو گڈمڈ کر گئے ہیں انھوں نے علت غیبت کو فلسفہ غیبت کا نام دے دیا ہے۔ یہ تینوں آراء اصل میں علت کے اجزاء کو ہی بیان کر رہی ہیں اور فلسفہ غیبت کی طرف کسی نے اشارہ نہیں کیا ہے۔ آیئے اب آپ کو فلسفہ غیبت کے بارے میں کچھ بتائیں۔

فلسفہ غیبت:

خداوند متعال نے انسان کو کمال تک پہنچانے کے لئے خلق کیا، اس کی

ہدایت کے انتظامات کئے، کتاب بھیجی، انبیاء بھیجے، شریعت بھیجی۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی تعلیمات کو تدریجاً معاشرے میں رائج کیا، آدمؑ سے تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ شروع ہوا، مختلف زمانوں میں یہ تعلیمات آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی چلی گئیں اور ان میں اضافہ بھی ہوتا رہا یہاں تک کہ آخری نبی محمدؐ پر شریعت کا نزول اختتام پذیر ہوا اور وحی کے نزول کی ضرورت نہیں رہ گئی بلکہ اب صرف اس شریعت کے مطابق معاشرہ کو ادارہ کرنے کی ضرورت تھی جس کے لئے ائمہؑ نے اپنی پوری پوری زندگیاں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج میں گزار دیں اور جہاں کہیں بھی اپنے حقیقی منصب یعنی "حکومت" کے عنوان سے ذمہ داری کا موقع ملا اسے بھی انجام دیا۔ وہ سب کے سب اسی راہ میں شہید ہوئے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے تک رسول خداؐ کے بتائے ہوئے احکامات و تعلیمات کی پوری تشریح ہو چکی تھی اور ائمہ علیہم السلام نے معاشرے میں ایسے افراد کی تربیت کر دی تھی جن کے ذریعہ یہ تعلیمات سینہ بہ سینہ آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتی رہیں تاکہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کو کسی مسئلہ میں اسلام کی نظر درکار ہو وہ اسے ان تعلیمات سے اخذ کر سکیں۔

یہاں پر ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ انسانی معاشرے کی تربیت کے مراحل بالکل وہی مراحل ہیں جنھیں انسان اپنے بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک طے کرتا ہے۔ بچہ کو شروع میں ہر کام کرکے دینا پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے کام خود سے انجام دے۔ اسے کھڑا ہونا سکھایا جاتا ہے پھر اسے سہارے کے ذریعہ چلایا جاتا ہے کچھ عرصہ بعد اس سے سہارا دور کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بغیر کسی سہارے کے بھاگ دوڑ سکے لیکن اس کو بالکل ہی مستقل حیثیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے بڑے ہمیشہ دور دور سے اس کا خیال رکھتے ہیں اور تدریجاً جیسے جیسے وہ تجربات

کرتا ہے ، تعلیم حاصل کرتا ہے ، علمی مدارج طے کرتا ہے ویسے ویسے اس کی شخصیت میں استقلال آتا چلا جاتا ہے اور ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس کو معاشرے میں مکمل طور پر مستقل حیثیت حاصل ہو جاتی ہے یہی انسانی معاشرہ کا حال ہے کہ اسکی تربیت کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور بارہ امام علیہم السلام بھیجے گئے اور ان سب نے اس معاشرہ کی تربیت کے مختلف مراحل کو انجام دیا یہاں تک کہ یہ تربیت اس مرحلہ پر پہنچ گئی کہ اب معاشرہ کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے اور مکمل اعتماد و طاقت کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھانا چاہیے ۔ البتہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں دور سے اس پر مکمل نظر رکھی جاتی ہے کہ اگر کہیں کوئی بہت بڑی غلطی کرنے لگے تو اس کو روک دیا جائے چھوٹی موٹی چوٹ کھالینے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ تربیت کے لئے مفید ہے ۔ لہذا معاشرہ جب اس مرحلہ پر پہنچا تو خداوند متعل نے بارہویں امام (ع) کو معاشرہ پر نظر رکھنے کی ذمہ داری دے دی اور معاشرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ اب وہ خود سے اپنے امور کی دیکھ بھال کرے ۔ تربیت کے اس مرحلہ کو اچھی طرح سے جاننے کے لئے اس مطلب پر غور کریں کہ انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ جس کام کے لئے خود اس کے عقل و دل کی طرف سے تحریک ہوتی ہے وہ اس کام کو زیادہ دلجمعی اور پائداری سے انجام دیتا ہے چاہے اس کے لئے اسے کتنی ہی مشقت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے لیکن وہ کام جس میں محرک کوئی اور ہے اتنی تیزی اور پائداری نہیں پائی جاتی مشکلات کے سامنے اس کی ہمت جلد جواب دے جاتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ان مشکلات کو بھی خود "محرک" ہی تحمل کرے گا ۔ اسی لئے جب معاشرہ ایک ایسے مرحلے پر پہنچا تو اسے ایک حد تک اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ اپنے تکامل کے آخری مراحل کو بطور احسن گزار سکے ۔ اس مرحلے کے اختتام پر حق و باطل اپنے اپنے عروج پر

ہوں گے اور باطل کے مکمل خاتمے کے لئے انشاء اللہ تعالی امام زمانہ (عج) خود ظہور کریں گے اور حق و عدالت پر مبنی ایک جامع نظام کریں گے۔

درس ۱۲

امام زمانہ (عج) کی غیبت میں حکومت کی ضرورت

نبوت کے درس میں ہم نے معاشرہ کے لیے ایک رہنما کی ضرورت کو ثابت کیا۔ اس کے بعد ہم نے امامت کے درس کے آخر میں بتایا کہ آخری امام (ع) غائب ہیں اور خداوند عالم نے ان کو منظر عام سے ہٹ کر امت کا خیال رکھنے کی ذمہ داری دی ہے۔ اس مقام پر ہم یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ اس مرحلے میں کیا امت کے لیے اب بھی کسی رہنما یا قائد کا ہونا ضروری ہے؟ دوسرے الفاظ میں کیا امام (ع) غیبت میں رہ کر بھی حاضر قائد کی طرح سے قیادت کرسکتے ہیں؟

ہماری نظر میں اب بھی ایک حاضر قائد کی ضرورت اپنی جگہ پر باقی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر امام (ع) غیبت میں رہ کر ایک حاضر قائد کی طرح قیادت کرسکتے ہوتے تو ہمارے نظریے کے مطابق ان کے منظرعام سے ہٹنے کی حکمت ہی فوت ہوجاتی۔ آیئے اپنی اس نظر پر عقلی دلیل پیش کریں۔

خداوند عالم نے انسان کو ایک اجتماعی فطرت و طبیعت کے مطابق خلق کیاہے۔ یعنی انسان ایک اجتماعی حیوان ہے۔ اسے اپنی حاجات کو پورا کرنے کے لیے تعاون اور مدد کی ضرورت ہے جو اجتماع کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ اسے اجتماع میں بے شمار ایسے مسائل پیش آتے رہتے ہیں جن کے حل

کے لیے ایسے نظام کی ضرورت ہے جسے قاطعیت کے ساتھ نافذ کیا جائے لہذا ایک ایسی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے جو اس کو نافذ کرسکے اسی لیے آپ کو پوری انسانی تاریخ میں ہر جگہ حکومت اور نظام کسی نہ کسی شکل میں نظر آجائیں گے۔ حتیٰ پتھر کے زمانے میں بھی ایک نظام اور ایک حکومت پائی جاتی تھی اس بات کو سمجھانے لیے ہم اسے اس طرح سے بھی بیان کرسکتے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں مختلف مزاج اور نفسانی خواہشات پائی جاتی ہیں، جیسے حب ذات، حسد، جاہ طلبی، شہرت طلبی وغیرہ۔ ان طبیعتوں کے مالک افراد کا ٹکراؤ ایک لازمی امر ہے اور اس ٹکراؤ کے حل کے لیے ایسے قوانین و مقررات کا ہونا ضروری ہے جنھیں ایک بڑی طاقت نافذ کرے، اس بڑی طاقت کو ہم حکومت کہتے ہیں جو ایک قائد کے بغیر ناممکن ہے بقیہ حیوانات بھی اس نظام سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جیسا کہ آپ چیونٹی اور شہد کی مکھی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس دلیل کی روشنی میں ہمیں امام (ع) کی غیبت میں بھی اپنے معاشرے کو ادارہ کرنے کے لیے ایک قائد کی ضرورت ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ اس قیادت کو کس کے ہاتھ میں دینا چاہیے کیوں کہ اب سب کے سب غیر معصوم اور غیر منصوص من اللہ ہیں۔ اس سلسلے میں بھی ہم اپنی عقل سے مدد لیتے ہیں کہ عقل کن صفات کو اس قائد کے لیے ضروری سمجھتی ہے؟

عقلاء کے نزدیک منتخب حاکم کے صفات:

یہ بہت واضح بات ہے کہ عقل مند انسان جب بھی کوئی کام کسی کے سپرد کرتا ہے۔ وہ فطری طور پر ذمہ داری کے لیے منتخب ہونے والے شخص میں کم از کم ان امور کو ضرور دیکھتا ہے:

۱۔ بقدر کافی عقل

۲۔ جو کام اس کے سپرد کئے جا رہے ہیں ان کے متعلق علم

۳۔ امانت ۔ تاکہ جو کام اس کے سپرد کیا جا رہا ہے اس میں سہل انگاری اور خیانت سے کام نہ لے جسے عدالت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص عمارت بنانے کے لیے کسی شخص کو ملازم رکھتا ہے ۔ تو لامحالہ فطرت کے حکم کے مطابق وہ ان شرائط و صفات کو پیش نظر رکھتا ہے ۔ امت کے معاملات کی مدیریت امت کے اہم ترین ، مشکل ترین اور نازک ترین امور میں سے ہے ، اس لیے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حاکم کو عوام منتخب کرتے ہیں اور وہ انتخاب میں آزاد و مختار ہیں تو عقل و فطرت کے حکم کے مطابق عوام پر لازم آتا ہے کہ جس شخص کو حاکم اور قائد کی حیثیت سے منتخب کرے ۔ وہ :

۱۔ عقل مند ہو ۔

۲۔ سیاست و تدبیر کے فنون اور باریکیوں سے واقف ہو ۔

۳۔ تنفیذ و اجراء کی قوت رکھتا ہو ۔

۴۔ امین ہو ۔ خائن نہ ہو ۔

حاکم میں ان صفات کی موجودگی کو عقلاء اپنی فطرت کے سبب ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی زبردستی یا تعبد کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا مذمت و ملامت کا مستحق ہے ۔

اسی طرح اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ جو لوگ حکومت کے معاملات کو کسی خاص شخص کے سپرد کر رہے ہیں وہ کسی ایسے خاص مبدء و سرچشمہ اور نظریہ پر ایمان رکھتے ہیں جو زندگی کے نظام میں معین و مخصوص قوانین کا حامل ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے اجتماعی اور سیاسی امور اس نظریہ اور ان قوانین کے مطابق

انجام دیئے جائیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسے شخص کا انتخاب کریں جو نہ صرف یہ کہ اس مبدء و نظریہ پر اعتقاد رکھتا ہو بلکہ اس کے قوانین کو بھی اچھی طرح جانتا ہو۔

ولایت فقیہ:

ہم نے شروع سے اب تک کی گفتگو میں انسانی زندگی کے لیے حکومت کی ضرورت کو ثابت اور ایک منتخب حاکم کے لیے ضروری شرائط کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی بتایا کہ عوام جہاں پر حاکم میں ان عمومی صفات کو مدنظر رکھتے ہیں وہاں پر اس بات کو بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ حاکم اس مبدء و نظریہ پر بھی اعتقاد رکھتا ہو اور زندگی کے معاملات و مسائل کے سلسلے میں اس کے عادلانہ اور مرتب قوانین کو بھی جانتا ہو تاکہ ان کے نفاذ پر قدرت پیدا کرسکے۔ اسلامی نکتہ نظر سے ہم ایسی حکومت کو "ولایت فقیہ" کا نام دیتے ہیں اور ایسے حاکم کو "ولی فقیہ" کہتے ہیں۔

یہ عنوان ائمہ علیہم السلام کے زمانے میں ان پر اور ان کے نائبین پر منطبق ہوتا تھا اور غیبت کے زمانے میں اس شخص پر منطبق ہوتا ہے جو کتاب و سنت اور اس کے احکام کو جانتا ہو البتہ مذکورہ شرائط کے ساتھ۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایک فقیہ کی ولایت و حکومت جو مذکورہ شرائط کا حامل ہو ہر اس مسلمان کی عقلی اور فطری آرزو ہے جو اسلام کی جامعیت کا معتقد ہو کیونکہ وہ اسے اسلامی قوانین کے نفاذ کا ضامن جانتا ہے۔

البتہ ولایت فقیہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمام کاموں کو اپنی ذات میں متمرکز کرلے، بینک بھی خود ہی چلائے، وزارت داخلہ، وزارت خارجہ، وزارت

خزانہ وغیرہ کو خود ہی ادارہ کرے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر کام کو اس کی لیاقت کے حامل شخص کے حوالے کرے اور خود نظارت کرے۔

ط

فہرستِ مضامین

درس ۱	دین	۷
درس ۲	دین کے بارے میں تحقیق ضروری ہے	۱۰
درس ۳		۱۲
درس ۴		۱۶
درس ۵	توحید	۱۹
درس ۶	ہدف خلقت	۲۲
درس ۷	عدل	۲۷
درس ۸	انبیاءؑ کی ضرورت	۳۲
درس ۹	امامت (۱)	۳۷
درس ۱۰	امامت (۲)	۴۲
درس ۱۱	امام آخرالزمان حضرت مہدی (عج)	۴۶
درس ۱۲	امام زمانہ (عج) کی غیبت میں حکومت کی ضرورت	۵۲